© rasailojaraid.com

دوسری قسط

فلسطین، اسرائیل اور سر ظفر اللہ خان

پروفیسر مشتاق خان کیانی (لندن)

جنرل صاحب کی خودنوشت میں اس بات کا متعلقاً ذکر نہیں ہے کہ کس طرح ایک فوجی جرنیل نے قومی فوج کو اپنی ذاتی ملکیت سمجھ کر اپنے ذاتی مفادات کے لیے ناجائز استعمال کیا اور ایک جمہوری طور پر منتخب حکومت کو برطرف کر کے ملک کا مطلق العنان حاکم بن بیٹھا۔

کسی بھی جمہوری ملک میں طاقت کا غلط یا ناجائز استعمال اور پھر اپنی داتی مفاد میں استعمال ایک سنگین جرم ہے۔ مجرم اگر فوجی ہے تو وہ کورٹ مارشل کا مستحق ہے۔ اگر غیر فوجی ہے تو وہ بغاوت کا مرتکب۔ دونوں صورتوں میں مجرم سزائے موت کا مستحق ہے۔ مگر جنرل پرویز مشرف اس سنگین جرم پر ایسی بددیانتی سے پردہ ڈالتے ہوئے بیان کرتے ہیں کہ گویا یہ جرم نہیں بلکہ ایک قومی خدمت اور ایک خوبصورت کھیل ہے۔ ان کی یہ کتاب ان کی بہادری اور ڈینگوں کی ہزار داستان ہے۔ ایک جوہری (Nuclear) طاقت ہونے کے باوجود وہ امریکہ کی ایک زبانی دھمکی سے اس قدر حواس باختہ ہو جاتے ہیں کہ وہ اپنی بہادری کی سب ڈینگیں بھول جاتے ہیں۔ ہتک آمیز اور شرمناک بزدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جنرل صاحب امریکہ کے صلیبی اور صہیونی جنگوں میں اس کے اتحادی بن جاتے ہیں اور جارج بش کے سامنے گھٹنے ٹیک کر کہتے ہیں:

ہم نے ان کے سامنے پہلے تو خنجر رکھ دیا
پھر کلیجہ رکھ دیا ، دل رکھ دیا ، سر رکھ دیا

اس غیر معمولی بزدلی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مشرف امریکہ کے توسیع پسندانہ سامراجی جنگوں میں شامل ہو کر ایک کرایہ کے سپاہی اور داروغہ بننے پر رضامند ہو جاتے ہیں اور لاکھوں افغان اور پاکستانی مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلتے ہیں۔ اور اس غداری کی قیمت دس بلین (ارب) ڈالر وصول کرتے ہیں:

دری خسروی کی غلامی تو لے لی
مگر جذبۂ کوہِ کُن بیچ ڈالا

پھر افسوسناک بات یہ ہے کہ جنرل مشرف کو اپنی اس واضح اور عریاں غداری کا نہ تو احساس ہے اور نہ ہی ندامت اور پشیمانی بقول اقبال:

وہ جو ناخوب تھا بتدریج وہی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتے ہیں قوموں کے ضمیر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یعنی غلامی میں جہالت، تنگ نظری، غداری، ضمیر فروشی، انتہاپسندی اور دہشت گردی روشن خیالی کے نام سے پکارے جاتے ہیں اور اس پر فخر کیا جاتا ہے۔ لہٰذا جنرل مشرف کی خودنوشت ہو یا جنرل ایوب خان کی یا سرظفر اللہ خان کی ''تحدیثِ نعمت'' اس قماش کی وہ تمام خودنوشت کتابیں جھوٹ اور غلط بیانی کے پلندے ہوتے ہیں اور ان کی کوئی علمی یا تاریخی حیثیت نہیں ہوتی۔

اگر انصاف سے دیکھا جائے تو مستقبل کا مؤرخ جب پاکستان کے حالات پر تبصرہ کرے گا تو وہ ہرگز ان تینوں حضرات کی خودنوشت کتابوں کو کسی بات کی تائید یا تردید میں بطور ثبوت پیش نہیں کرے گا۔ کیوں کہ یہ سب جھوٹ، غلط بیانی، خودستائی اور مصنف کی انائیت (Ego) کی تشہیر کے سوا اور کچھ نہیں ہیں:

خدا ہم کو ایسی خدائی نہ دے
جو اپنے سوا کچھ دکھائی نہ دے

جناب راجہ نصر اللہ خان کی سادگی (Naivety) پر اکثر تعجب ہوتا ہے اور ترس بھی آتا ہے۔ وہ اپنے بے بنیاد دعویٰ کے ثبوت میں ایک اور ٹوڈی، وفادار خدمت گزار جناب شاہد امین کی گواہی سرظفر اللہ خان کی تائید میں پیش کرتے ہیں۔ میں تو شروع سے کہتا چلا آ رہا ہوں کہ سرظفر اللہ خان اور سر ملک فیروز خان نون کی مہربانی سے پاکستان کی وزارتِ خارجہ ٹوڈیوں، برطانوی سامراج کے کاسہ لیسوں، ذہنی غلاموں اور خطاب یافتہ ''غلامانِ خاص'' سے بھرپور ہے۔ یہ سب برطانوی اور امریکی سامراج کے ایجنٹ ہیں اور اپنے آقاؤں کے لیے کام کرتے رہے ہیں اور کرتے ہیں۔ یہ لوگ روایتی منافقت سے کام لیتے ہوئے ظاہراً یہ بتاتے ہیں کہ وہ پاکستان اور پاکستانی عوام کے مفادات کے لیے کام کرتے ہیں۔ اپنی بے بنیاد اور ناقص کارکردگی کی ایسی لمبی لمبی روداد بنا کر پیش کر کے ایک دوسرے کے فرضی کارناموں کے گیت گاتے ہیں اور ایک دوسرے کی تعریف کے مینار تعمیر کرتے ہیں اور عام لوگوں کو بیوقوف بنانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ کاش کہ ان مفاد پرست اور سامراج کے گماشتوں کے یہ دعوے کہ وہ ملک اور قوم کی خدمت کرتے ہیں، سچے ہوتے تو پھر ملک کا یہ حشر نہ ہوتا۔ پاکستانی حاکموں اور سامراج کے گماشتوں اور مارِ آستینوں کو مخاطب کر کے مرحوم مصطفیٰ زیدی نے کیا خوب کہا تھا:

تم نے ہر عہد میں ہر نسل سے غداری کی　　تم نے بازاروں میں عقلوں کی خریداری کی
تم نے ہر دور میں دانش پہ کئی وار کیے　　جبر کے منہ میں دہکتے ہوئے الفاظ دیئے
اپنی آرائش اک عمرِ گریزاں کے لیے　　سب کو تاراج کیا، اپنے مراعات کے لیے
تم تو سکوں کی لپکتی ہوئی جھنکاروں میں　　اپنی ماؤں کو اٹھا لاتے ہو بازاروں میں

چنانچہ جناب شاہد امین سرظفر اللہ خان کی دفاع اور تعریف میں فرماتے ہیں کہ اقوامِ متحدہ میں سرظفر اللہ خان نے کشمیر سے متعلق پاکستان کا کیس بڑے مضبوط طریقے سے پیش کیا تھا۔ کسی کیس کو مضبوطی سے پیش کرنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ کیس جس کی آپ وکالت کر رہے ہیں، جیت جاتے ہیں یا حالات کو اپنے مؤکل کے حق میں بہتر بنانے میں کامیاب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہو جاتے ہیں۔ اگر آپ یہ نہیں کر سکتے ہیں تو پھر اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ آپ وہ کیس ہار گئے۔ اس صورت میں آپ کا یہ دعویٰ کہ میں نے کیس مضبوطی سے پیش کیا محض جھوٹ، دھوکہ اور فریب ہے۔ اس طرح کے دعوے کھوکھلے، بے معنی اور گمراہ کن دعوے ہیں اور ان کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔ اس طرح کے جھوٹے دعوے عوام کو بے وقوف بنانے کے لیے کیے جاتے ہیں۔ پھر یہ ایک حقیقت ہے کہ کس کیس کی مضبوطی یا کمزوری سے پیش کرنے کا دارومدار نتائج پر ہوتا ہے۔ نتائج کے لحاظ سے اگر ہم دیکھیں تو کشمیر میں ۱۹۴۷ء سے لے کر آج تک نہ تو پاکستان کے حق میں اور نہ کشمیریوں کے حق میں کوئی پیش رفت ہوئی ہے بلکہ پاکستان کی پوزیشن اور زیادہ خراب اور پاکستان کا کیس بہت کمزور ہو گیا ہے۔ کشمیر میں حالات میں کوئی تبدیلی یا بہتری نہیں آئی ہے۔ کشمیر پر ہندوستان کا تسلط اور زیادہ مضبوط ہو گیا ہے اور کشمیری عوام بدستور ہندوستانی مظالم کی چکی میں پس رہی ہے۔ ان حقیقی اور زمینی حالات اور واقعات سے آنکھیں بند کرنا اور متواتر یہ رٹ لگانا کہ ''سر ظفر اللہ خان نے اقوامِ متحدہ میں کشمیر کے حوالہ سے پاکستان کا کیس مضبوطی سے پیش کیا تھا۔'' ایک گمراہ کن اور جھوٹا دعویٰ ہے اور احمقانہ بددیانتی کی انتہا ہے۔ پھر ظاہر ہے کہ شاہد امین جیسے فرماں بردار اور سامراج کے پلے ہوئے خادم اپنے مربی کی آخر تعریف ہی کریں گے۔ یہ وہی ''بیٹے کی صدارت میں باوا کی غزل خوانی'' والی بات ہوئی۔

اب ہم سر ظفر اللہ خان کی خود نوشت ''تحدیثِ نعمت'' پر تفصیل سے بحث کریں گے اور قارئین کرام پر واضح کریں گے کہ جس کتاب کو راجہ نصر اللہ خان، سر ظفر اللہ خان کے قومی اور ملکی خدمات کی سند سمجھ کر پیش کرتے ہیں، وہ کس قدر جھوٹ، غلط بیانی، گمراہ کن پراپیگنڈا اور ذہنی بددیانتی کا مرقع ہے۔

مارچ ۲۰۰۰ء میں تل اویو اسرائیل سے ایک کتاب چھپی تھی، کتاب کا نام ہے:

Beyond the Veil- Israel- Pakistan Relations. By Prof. P.R Kumara Sawami. Jaffe Centre for Stratefgic Studies. Telaviv University- Israel.

اس کتاب کا اردو ترجمہ ہو گا: ''پردہ کے پیچھے اسرائیل اور پاکستان کے تعلقات'' اس کتاب میں اسرائیل اور پاکستان کے تعلقات کے خفیہ سفارتی تعلقات کے رخ سے پردہ ہٹایا گیا ہے تاکہ پردہ کے پیچھے جو چہرے ہیں وہ صاف نظر آئیں۔ پردہ اٹھ جانے کے بعد جو چہرہ نمایاں نظر آتا ہے وہ یادش بخیر ہمارے ہیرو سر ظفر اللہ خان ہیں۔ چنانچہ یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ۱۹۴۵ء میں جب خان صاحب ایک کانفرنس میں شرکت کے لیے لندن تشریف لاتے ہیں تو پہلے سے تیار کردہ ایک پلان کے مطابق فوراً ان کی ملاقات مسٹر چیم ویزمین (Mr. Chaim Weizmann) سے کرائی جاتی ہے جو کہ جوئش ایجنسی کے صدر ہیں۔ پہلی ملاقات میں مسٹر ویزمین اس قدر بے تکلف ہو جاتے ہیں کہ ہمارے ''شیرِ قادیان'' کو فلسطین آنے کی دعوت دیتے ہیں۔ یہ جانتے ہوئے کہ فلسطین ایک متنازعہ علاقہ ہے اور جوئش ایجنسی فلسطین میں ایک یہودی ریاست قائم کرنے کی جدوجہد میں سرگرم عمل ہے۔ ان حقائق کے باوجود ہمارے شیرِ قادیان فوراً اور بلا پس و پیش اس ہنگامی دعوت کو قبولیت کا شرف بخشتے ہیں اور فلسطین کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ بلکہ نہایت بے چینی سے اس گھڑی کا انتظار کرتے ہیں۔ فلسطین

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں یہودی ایجنسی کے کارکن پہلے سے چشم براہ ہیں اور سر ظفر اللہ خان کا بے چینی سے انتظار کر رہے ہیں۔ ان کی فلسطین آمد پر ان کا شاہانہ استقبال کیا جاتا ہے اور اعلیٰ مہمان نوازی جو خاص دوستوں کے لیے مخصوص ہوتی ہے سے ان کو نوازا جاتا ہے۔ ایک ہفتہ مخصوص مہمان نوازی، سیر و تفریح اور مکمل ذہن شوئی کے بعد سر ظفر اللہ خان مسٹر ویز مین کو بے مثال مہمان نوازی کے لیے شکریہ کا خط لکھتے ہیں اور یہ بھی لکھتے ہیں کہ ''یہاں آنے سے پہلے مجھے معلوم نہ تھا کہ مسئلہ فلسطین اس قدر پیچیدہ اور مشکل مسئلہ ہے مگر مجھے امید ہے کہ اس کا کوئی نہ کوئی حل ضرور نکل آئے گا۔'' اگرچہ سر ظفر اللہ خان نے یہ بتانے کی زحمت نہ کی کہ آخر وہ مشکلات کیا ہیں اور ان مشکلات کا حل ان کے ذہن میں کیا ہے۔ مگر بعد کے واقعات اور حالات بتاتے ہیں کہ یہ ''مشکلات'' اور ان کا ''حل'' کیا تھا۔ دراصل یہ حل جس کے بارے میں خان صاحب نے اشارہ کیا ہے۔ یہ فلسطین کی تقسیم اور یہودی ریاست کا قیام ہے۔ کیوں کہ یہودی اور عیسائی صہیونی ایک عرصہ سے فلسطین کی تقسیم کا مطالبہ کر رہے تھے۔ چنانچہ اس مطالبہ کو تسلیم کرتے ہوئے برطانوی حکومت نے ۱۹۱۷ء میں بالفر (Balfour) اعلانیہ کے ذریعے اس بات کی تصدیق کر دی کہ تقسیم فلسطین اور ایک یہودی ریاست کا قیام ان کا نصب العین ہے۔ مگر جونہی فلسطینی عربوں کو اس سازش کا پتا چلا تو پھر انھوں نے سخت مخالفت شروع کی اور فلسطین کی تقسیم کے صہیونی منصوبے کو روکنے کی کوشش شروع کی۔ فلسطینی عربوں کی مخالفت زور پکڑ گئی تو برطانوی سامراج اور یہودی، عیسائی صہیونی اداروں کو بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ایسے مشکل وقت میں برطانوی سامراج کو ہمیشہ اپنے پرانے اور آزمائے ہوئے وفادار، نمک خوار اور تابعدار خادموں کی ضرورت پڑتی ہے۔ چنانچہ ایسے کٹھن وقت میں بھلا ''شیرِ قادیان'' سے بہتر کون خدمت انجام دے سکتا تھا۔ کیوں کہ چودھری ظفر اللہ خان اپنی وفاداری کے ثبوت میں یہ فخریہ اعلان کر سکتے تھے کہ:

میں اُن اجداد کا فرزند ہوں کہ جنھوں نے پیہم
ایک اجنبی قوم کی سایہ کی حمایت کی ہے
غدر کی ساعتِ ناپاک سے لے کر آج تک
ہر کڑے وقت میں انگریز کی خدمت کی ہے

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ سر ظفر اللہ خان برطانوی سامراج کے غیر رسمی سفیر کے طور پر صہیونی ایجنسی کی دعوت پر خود فلسطین جا کر حالات کا جائزہ لیتے ہیں اور پھر عربوں کو یہ قائل کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ مسئلہ فلسطین کا واحد حل تقسیم فلسطین ہے اور عربوں کا فائدہ اسی میں ہے کہ وہ تقسیم فلسطین کو قبول کریں اور مخالفت سے باز آ جائیں۔ مگر اس بات پر کسی کو تعجب نہیں کرنا چاہیے کہ سر ظفر اللہ خان نے اپنی خودنوشت ''تحدیثِ نعمت'' میں اس اہم واقعہ کا ذکر نہیں کیا ہے کہ وہ صہیونی ایجنسی کی دعوت پر فلسطین گئے تھے۔ اس ابتدائی فلسطینی دورے کے بعد جو صہیونی ایجنسی کے زیر اہتمام منظم ہوا تھا۔ آپ مشرقِ وسطیٰ کے دوسرے عرب ممالک یعنی مصر اور شام (سوریہ) کا بھی دورہ فرماتے ہیں اور دوسرے عربوں کو بھی قائل کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ تقسیم فلسطین سے متعلق وہ برطانوی اور صہیونی تجاویز کو قبول کریں مگر کمال عیاری، شاطری اور روایتی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بد دیانتی سے کام لیتے ہوئے سر ظفر اللہ خان نے ان تمام واقعات کو سراسر نظر انداز کیا اور اپنی خود نوشت میں کوئی ذکر نہیں کیا۔

جیسا کہ میں نے پہلے ذکر کیا ہے، اسرائیل کے قائم ہونے اور صہیونی عزائم کے کامیاب ہونے کے آثار روز بروز عیاں اور واضح ہوتے نظر آ رہے تھے۔ اس کے نتیجہ میں عربوں میں بڑی بے چینی اور اضطراب کی کیفیت پیدا ہو رہی تھی اور مخالفت میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔ ان حالات سے نمٹنے کے لیے سر ظفر اللہ خان کو یہودی ایجنسی کی چھتری تلے اور برطانوی سامراج کے ایماء پر مشرقِ وسطیٰ اور فلسطین بھیج دیا گیا۔ ان کے فرائض میں دو باتیں شامل تھیں:

(۱) وہ ایک اچھے مخبر یا جاسوس کا کردار ادا کریں اور یہ معلوم کر کے برطانوی حکومت کو آگاہ کریں کہ عربوں کا عندیہ کیا ہے، وہ کیا چاہتے ہیں اور آئندہ ان کے عزائم و ارادے کیا ہیں؟

(۲) افہام و تفہیم اور گفت و شنید کے ذریعے فلسطینی عربوں کو مخالفت سے باز رکھا جائے اور ان کو اس بات پر قائل کیا جائے کہ تقسیم فلسطین ضروری ہے۔

انگریزوں کے لیے جاسوسی کرنا اور مخبر بننا نہ کوئی نئی بات تھی اور نہ یہ عیب سمجھی جاتی تھی۔ بلکہ تمام ٹوڈیوں اور خطاب یافتہ غلاموں کے لیے تمغۂ امتیاز اور انتہائی وفاداری کی علامت سمجھی جاتی تھی۔ بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ہندوستان میں انگریز سامراج کا تمام کاروبار اور مؤثر طرزِ حکومت کی کامیابی کا دارومدار جاسوسی اور مخبری پر منحصر تھا۔ خان صاحب کے ''پیرومرشد'' یعنی مرزا غلام احمد قادیانی انگریزوں کے جاسوس تھے اور اس جاسوسی پر فخر کرتے تھے اور اسے اپنی وفاداری اور تابعداری کے ثبوت میں پیش کر کے اپنے آپ کو ''غلامانِ خاص'' میں شمار کرتے اور مزید مراعات کے طالب ہوتے۔

چنانچہ مرزا صاحب خود فرماتے ہیں:

> ''چونکہ قرین مصلحت ہے کہ سرکارِ انگریزی کی خیرخواہی کے لیے ایسے نافہم مسلمانوں کے نام بھی نقشہ جات (لسٹ) میں درج کیے جائیں جو درپردہ اپنے دلوں میں برٹش انڈیا کو دارالحرب قرار دیتے ہیں اور ایک چھپی ہوئی بغاوت کو اپنے اندر رکھ کر فساد کرتے ہیں۔ لہٰذا یہ نقشہ (لسٹ) اسی غرض سے تیار کیا گیا ہے تاکہ اس میں اُن ناحق شناس لوگوں کے نام لکھوں جو ایسے باغیانہ سرشت کے آدمی ہیں......اس لیے ہم نے اپنی محسن گورنمنٹ کی پولیٹیکل خیرخواہی کی نیت سے یہ چاہا کہ ان شریر لوگوں کے نام لکھے جائیں۔''
>
> (درخواست مرزا غلام احمد، قادیان، تبلیغ رسالت، جلد۵، صفحہ۱۱، ۱۸۹۶ء)

مگر یہ سر ظفر اللہ خان اور ان کی احمدی جماعت سے بڑی ناانصافی ہوگی۔ اگر میں کہوں کہ صرف خان صاحب اور ان کی جماعت کے لوگ اس مذموم اور غلامانہ خدمت اور کاروبار میں مصروف تھے، نہیں ایسا نہیں تھا۔ ہندوستان کے تقریباً سب ٹوڈی جاگیردار اور خطاب یافتہ خدمت گار اس غلامانہ خدمت گزاری میں مصروف تھے اور ہندوستان کے بڑے مشہور اور قدر آور شخصیات اس غلامانہ اور مذموم کاروبار میں مشغول و مصروف تھے۔ پہلی جنگِ عظیم کے دوران جب کہ ترکی کی عثمانیہ سلطنت انگریزوں کے خلاف جنگ میں شامل ہوگئی تو ہندوستان کے عام باشندوں (ہندو، مسلم) کی ہمدردیاں ترکوں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے ساتھ تھیں۔ اسی زمانے میں تحریک خلافت وجود میں آئی اور عثمانی سلطنت کے حق میں سیاسی اور اجتماعی سرگرمیاں بڑے زور وشور سے چلتی رہیں۔ اس وجہ سے ترکی کے سلطان عبدالحمید دوم ہندوستانیوں کے لیے بڑے دوستانہ اور احترام کے جذبات رکھتے تھے۔ اس جذبہ سے فائدہ اٹھانے کے لیے ہندوستان کو انگریز حکومت نے سر سلطان محمد شاہ آغا خان (موجودہ آغا خان کے دادا) کو جاسوسی اور مخبری مشن پر ترکی بھیجا۔ چنانچہ ۱۹۱۵ء سے لے کر ۱۹۲۳ء تک آغا خان متواتر ترکی جاتے رہے اور سلطان عبدالحمید سے ملتے رہے۔ آغا خان کے جاسوسی مشن کا مقصد یہ تھا کہ وہ سلطان کو اعتماد میں لے کر جنگ سے متعلق ان کے خیالات اور آئندہ منصوبہ بندی کے راز معلوم کرکے انگریز حکومت تک پہنچائے۔ چنانچہ آغا خان نے انگریز کے حسبِ منشا یہ خدمات انجام دیں اور ان خدمات کے صلہ میں ان کو ''ہز ہائی نس'' (His Highness) کا شاہی خطاب دیا گیا۔ ۱۹۶۹ء میں جب برطانوی کیبنٹ کے خفیہ ریکارڈ چھپ کر منظر عام پر آئے تو تب پتا چلا کہ آغا خان صاحب انگریز سامراج کے جاسوس تھے اور مخبری کرتے تھے۔ مگر سر ظفر اللہ خان کی طرح آغا خان صاحب نے بھی ان واقعات کا ذکر اپنی خودنوشت میں نہیں کیا۔ اس سلسلہ میں مزید تفصیلات میں جانا چونکہ میرے موضوع سے باہر ہے، اس لیے میں فقط اس شعر پر اکتفا کروں گا:

داورِ محشر! میرا نامۂ اعمال نہ دیکھ
اس میں کچھ پردہ نشینوں کے بھی نام آتے ہیں

مشرقِ وسطیٰ کی جاسوسی مہم پر روانہ ہونے سے پہلے سر ظفر اللہ کے ساتھ ایک صہیونی (Zionist) جاسوس بھی نتھی کر دیا گیا تھا۔ مسٹر ایریل ہائیڈ (Mr. Aeriel Heyd) جوئش ایجنسی میں جاسوسی امور کے نگران تھے۔ مسٹر ہائیڈ (Mr. Heyd) کا سر ظفر اللہ خاں کے ساتھ سفر کرنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ جوئش ایجنسی یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ سر ظفر اللہ خاں کس قدر یہودی اور عیسائی صہیونی پروگرام کے مطابق کام کرتے ہیں۔ چنانچہ مسٹر ہائیڈ نے سر ظفر اللہ خاں کی تمام نجی ملاقاتوں اور تقریروں کی خفیہ رپورٹ مسٹر چیم ویزمین (Mr. Chaim Weimann) کو بھیجتے رہے۔ یہ خفیہ رپورٹیں دیکھ کر مسٹر ویزمین بہت خوش ہوتے تھے۔ کیوں کہ ان رپورٹوں کے مطابق سر ظفر اللہ خان میں ایک بہت بڑی ذہنی تبدیلی نمایاں طور پر نظر آرہی تھی۔ اب وہ عام ہندوستانیوں کے برخلاف تقسیم فلسطین اور قیامِ اسرائیل کے حامی نظر آرہے تھے۔ ان ذہنی تبدیلیوں کی خبر پا کر مسٹر ویزمین بہت خوش ہوئے اور سر ظفر اللہ خان کو خط لکھا اور اس تبدیلیٔ قلب پر اُن کا شکریہ ادا کیا۔
(دیکھیے مسٹر ویزمین کی ڈائری)

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ وسط انیسویں صدی سے عیسائی اور یہودی صہیونی (Zionists) اس کوشش میں لگے ہوئے تھے کہ یہودیوں کو لا کر فلسطین میں آباد کیا جائے۔ چونکہ یہ علاقہ ترکی کی عثمانیہ سلطنت کے تحت تھا تو برطانوی حکومت نے سفارتی اور غیر سفارتی ذرائع سے ترکی حکومت پر دباؤ ڈال کر یہودیوں کو فلسطین میں آباد کرنے کی کوششوں میں لگی رہی۔ برطانوی سیاست کی بڑی مشہور شخصیات اس معاملہ میں سرگرم عمل تھیں۔ لارڈ پامرزٹن (Lord Palmerston) جو دو دفعہ وزیراعظم اور تین دفعہ وزیرخارجہ رہ چکے تھے، اپنے قریبی دوست لارڈ شفبری (Lord

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(Shaffesbury) سے مل کر یہودیوں کو فلسطین میں آباد کرنے کے بڑے حامی اور سرگرم عمل صہیونی تھے۔ چونکہ یہ دونوں حضرات نہایت بنیاد پرست اور کٹر قسم کے عیسائی تھے اور عیسائی عقائد کے مطابق یسوع مسیح کے دوبارہ آنے سے پہلے یہودیوں کا فلسطین میں آباد ہونا ضروری ہے۔ اس لیے یہ حضرات طرح طرح کے حیلہ بہانہ سے یہودیوں کو فلسطین میں آباد کرنے کی کوششوں میں لگے رہے اور اس سلسلہ میں انھوں نے اپنا سرکاری اور غیر سرکاری اثر ورسوخ استعمال کیا۔ پھر ہم دیکھتے ہیں کہ بیسویں صدی کے آغاز میں برطانیہ کے دو مشہور وزیراعظموں نے یعنی لائیڈ جارج (Lioyd George) اور ونسٹن چرچل (Winston Churchill) نے یہودیوں کو فلسطین میں آباد کرنے اور قیامِ اسرائیل میں نمایاں کردار ادا کیا۔ بلکہ اگر چرچل کو اسرائیل کی پیدائش کی دائی کہا جائے تو یہ مبالغہ نہ ہوگا۔ مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے پروفیسر ڈین شربُرک کی کتاب ''دی پولیٹکس آف اپکلپس The Politics Of Apocalypes, By Prof. Dan. Sherbok اور پروفیسر کرس ہیج کی کتاب ''امریکی فسطائی The American Facists By Prof. Chris Hedges.

عالمی جنگ عظیم اوّل کے بعد جب سلطنت عثمانیہ ختم ہو رہی تھی تو برطانیہ اور فرانس نے ۱۹۱۶ء میں ایک خفیہ معاہدہ کے ذریعے جو Sykes-Picot کے نام سے مشہور ہے۔ مشرقِ وسطی کو آپس میں تقسیم کیا۔ اسی بندر بانٹ کے ذریعے برطانیہ نے عراق اور فلسطین پر قبضہ جما لیا اور فرانس نے شام (سوریہ) پر اپنا قبضہ مضبوط کیا۔ فرانس کا شام پر قبضہ اور دلچسپی کی دو وجوہات تھیں:

(۱) صلیبی جنگوں کے زمانہ سے کچھ فرنچ نسل کے عیسائی شام میں چھپ کر رہ گئے تھے۔ فرانس ان فرنچ نسل کے عیسائیوں کے ذریعے اپنا مستقل قبضہ جمانا چاہتا تھا اور شام کے دو ٹکڑے کر کے ایک نیا ملک لبنان کے نام سے پیدا کر کے ان فرانسیسی نسل کے عیسائیوں کو دینا چاہتا تھا۔

(۲) دوسری وجہ یہ تھی کہ گیارہویں صدی کے صلیبی جنگوں میں غازی صلاح الدین ایوبی کے ہاتھوں فرانس کی صلیبی فوجوں کی بڑی پٹائی ہوئی تھی اور ذلت آمیز شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اتنی صدیاں گزر جانے کے بعد بھی فرانس کے حکمران اُس ذلت آمیز شکست کو نہیں بھولے تھے، وہ انتقام کی آگ میں جل رہے تھے۔

اتنی صدیاں گزر جانے کے باوجود وہ آگ ٹھنڈی نہیں ہوئی تھی۔ اس جنونی انتقام کا جذبہ شام پر دوبارہ قابض ہونے کے لیے متحرک تھا۔ چنانچہ ۱۹۱۶ء کے خفیہ معاہدہ (Sykes-Picot) کے تحت جب شام فرانس کے قبضہ میں آیا تو جنرل ہنری گورود (General Henri Gouraud) شام کا پہلا فرانسیسی گورنر مقرر ہو کر فاتحانہ طور پر دمشق میں داخل ہوا اور سب سے پہلے صلاح الدین ایوبی کی قبر پر پہنچ گئے۔

نہایت گہرا جنونی مذہبی تعصب اور احمقانہ تنگ نظری کا مظاہرہ کرتے ہوئے سینہ تان کر صلاح الدین ایوبی کی قبر پر کھڑا ہوا اور یوں للکار کر قبر سے مخاطب ہوا:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

''صلاح الدین! دیکھ ہم پھر سے آ گئے ہیں۔ میرا اس وقت یہاں موجود ہونا اس بات کی دلیل ہے اور گواہی ہے کہ صلیب کو ہلال پر تقدس اور برتری حاصل ہے۔''

ہم جو ٹھہرے اجنبی اتنی ملاقاتوں کے بعد
خون کے دھبے دھولیں گے کتنی برساتوں کے بعد

قارئین کرام! اب اس تاریخی پس منظر کی مختصر تشریح کے بعد دیکھئے کہ سرظفر اللہ خان اپنی خودنوشت میں اس غاصبانہ، ظالمانہ، جنونی، متعصب، انتقامی بندر بانٹ کو کس طرح ہمدردانہ اور معصومانہ انداز میں پیش کرتے ہیں اور اس بیانک جرم ملک گیری پر کس دل کش انداز میں پردہ ڈالتے چلے جاتے ہیں۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں:

''البتہ دمشق اور حلب کے مغربی جانب کے علاقے کے لیے ممکن ہے، کسی خاص نظام کی ضرورت پیش آئے۔ کیوں کہ اس علاقے میں فرانس کی بعض خاص ذمہ داریاں ہیں۔'' (''تحدیث نعمت''، ص ۴۸۵)

وہ ''خاص نظام'' کیا ہے، جس کی یہاں ''ضرورت'' پیش آ رہی ہے اور وہ ''خاص ذمہ داریاں'' کیا ہیں؟ ان باتوں کی تشریح سے سرظفر اللہ خان دانستہ گریز کرتے ہیں۔ حالانکہ ان کو بخوبی معلوم ہے کہ ان ''خاص ذمہ داریاں'' کیا ہیں اور ''خاص نظام'' کا کیا مطلب ہے مگر میں قارئین کو بتا تا چلوں کہ یہ ''خاص نظام'' اور یہ ''خاص ذمہ داریاں'' یہ اشارہ ہے شام کی تقسیم، ایک ملک لبنان کی تخلیق اور صلیبی جنگوں کے انتقام کی طرف۔ مگر سرظفر اللہ خان کھلم کھلا ان جرائم کو بیان کر کے اپنے صہیونی اور سامراجی آقاؤں کو کیسے ناراض کر سکتے تھے۔ اس لیے تو وہ اس بات کو اور تاریخی واقعات کو گول مول کر گئے:

لے گئے تثلیث کے فرزند میراثِ خلیل
خشتِ بنیاد کلیسا بن گئی خاکِ حجاز

اسی طرح خان صاحب فلسطین کے حالات اور صہیونی یلغار کی بات کرتے ہیں تو بدستور روایتی بددیانتی اور دروغ گوئی کا سہارا لے کر حقیقی حالات و واقعات پر پردہ ڈالتے ہوئے غلط بیانی سے قارئین کی توجہ اصل مسائل سے ہٹانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثلاً فرماتے ہیں:

''۱۹۳۴ء تک صہیونیت فلسطین میں اپنے قدم جما چکی تھی اور اس کا اقتدار بڑھتا جا رہا تھا۔ عرب اراضیات بتدریج صہیونی ایجنسی کی ملکیت اور تصرف میں منتقل ہو رہی تھی۔'' (''تحدیثِ نعمت''، ص ۸۷۔۴۸۶)

جن لوگوں کو حالات اور واقعات کے تاریخی پس منظر کا علم ہے وہ دیکھ رہے ہیں کہ سرظفر اللہ خان کس چالاکی، عیاری اور بددیانتی سے مگر معصومانہ انداز میں صہیونی جرائم پر پردہ ڈالتے ہوئے چلے جاتے ہیں اور یہ تاثر دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ صہیونیت کا فلسطین میں قدم جمانا اور عرب زمینوں پر قابض ہونا گویا ایک قدرتی اور فطری عمل تھا جو کہ بتدریج خود بخود ظہور پذیر ہو رہا تھا۔ ایسا قدرتی اور فطری عمل جیسا کہ پانی ہمیشہ قدرتی طور پر اور خود بخود فراز سے نشیب کی طرف بہتا ہے۔ جیسے دن کے بعد رات اور رات کے بعد دن قانونِ قدرت کے فطری عمل کے پابند ہیں۔

جاری ہے

© rasailojaraid.com